

تنہائی

تنہائی موجودہ صدی کی مہلک ترین بیماری بنکر سامنے آئی ہے۔ برطانیہ میں Jo Cox Commission رپورٹ انتہائی سنجیدہ اور قابل غور ہے۔ 2017 میں پورے ایک سال کی تحقیق اور تجزیہ کے بعد یہ دستاویز شائع کی گئی۔ اسکو مرتب کرنے والے کوئی اور نہیں، بلکہ برطانوی پارلیمنٹ کی خاتون ممبران تھیں۔ راجیل ریویز، سیمائینڈی اور جو کوکس اس رپورٹ سے موجودہ زمانے کی سب سے بڑی بیماری کو سامنے لائے ہیں۔ تنہائی (Loneliness) برطانیہ کی اکثریت کو نگل چکی ہے۔ تقریباً ایک کروڑ برطانوی شہری اسکا شکار ہیں۔ یہ مکمل آبادی کا دس فیصد سے زیادہ حصہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق موبائل فون اور کمپیوٹر، انسانی تعلقات پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ اکثر لوگ سیل فون کو اپنا بہترین دوست سمجھتے ہیں۔ اس رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ تنہائی کے بدن پر منفی اثرات ایسے ہی ہیں جیسے کوئی شخص پندرہ سگریٹ بلا ناغہ پیے۔ صرف برطانیہ میں اس بیماری کی بدولت بتیس بلین یورو کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس رپورٹ کے مندرجات نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ برطانیہ کی تاریخ یا شاید دنیا کی موجودہ تاریخ میں پہلی بار "وزیر برائے تنہائی" مقرر کیا گیا ہے۔ جنوری 2018 میں تریس کروچ اس عہدے پر مقرر ہوئی ہیں۔ انکے مطابق پوری سیاسی زندگی میں یہ چیلنج سب سے قابل ذکر ہے۔ لندن میں بے شمار سائنسدان، این جی اوز کے سربراہ، ڈاکٹر صاحبان اور حکومتی عمائدین سر جوڑ کر بیٹھے ہیں کہ اس مہلک بیماری کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ تنہا لوگوں کو کس طرح زندگی کے دھارے میں واپس لایا جائے۔ یہ اس صدی کا سب سے بڑا چیلنج ثابت ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں اس مہلک بیماری یعنی تنہائی کے متعلق کسی قسم کی سنجیدہ تحقیق یا سوچ موجود نہیں ہے۔ گزارش ہے کہ اکثریت تسلیم ہی نہیں کریگی کہ یہ بھی کوئی ذہنی یا جسمانی بیماری ہے۔ یہاں تو تمام لوگ خوش و خرم اور بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر نہیں بھی تو کہنے میں کیا حرج ہے۔ مگر تسلیم نہ کرنے سے معاملات تبدیل نہیں ہو سکتے نہ حقائق بدل سکتے ہیں۔ ایک غیر ملکی سیاح خاتون نے پاکستان کے طول و عرض کو انتہائی غور سے دیکھا، سفر کیا۔ مختلف صوبوں میں گئی۔ واپسی پر پوچھا گیا کہ ملک کیسا لگا۔ جواب تھا کہ میں ملک کے شہروں سے لیکر دیہاتوں تک گئی ہوں۔ سڑکوں پر لاکھوں مرد، خواتین اور بچے دیکھے ہیں۔ سینکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے۔ پورے ملک یعنی پاکستان میں ایک بھی فرد ایسا نظر نہیں آیا، جسکے چہرے پر فطری مسکراہٹ ہو۔ جو دیکھنے میں خوش نظر آئے۔ یہ خوفناک بات ہے۔ اسکو رد کرنا بہت مشکل ہے۔ ارد گرد دیکھیے۔ آپکو ہر طرف لوگ غصے کی کیفیت میں نظر آئینگے۔ معروضی حالات ایک طرف، مگر سپاٹ سے چہرے، رونق سے مفقود آنکھیں، ہر طرف نظر آئیگی۔ یہ تنہائی کی غار میں گرنے کی پہلی منزل ہے۔ معاشرہ کی موجودہ ساخت کو دیکھیے۔ ہر عمر کے لوگوں کے عملی رویوں کا تجزیہ کیجئے۔ اکثریت ہر وقت موبائل فون دیکھنے میں مصروف ہوگی۔ اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی تقریب میں گئے ہیں۔ وہاں لوگ ایک دوسرے سے بات کرنے کی بجائے اپنے فون پر تصویریں دیکھنا یا اس پر غور کرنے میں مصروف ہونگے۔ چند دن پہلے رات کے کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں چھ افراد تھے۔ ایسا لگا کہ یہ تمام لوگ دوست نہیں بلکہ ایک دوسرے کیلئے

مکمل طور پر اجنبی ہیں۔ تھوڑی سی بات چیت کے بعد تمام اپنے موبائل فون پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سکرین کو اتنی محنت سے پڑھنے لگے کہ لگتا تھا کھانا کھانے نہیں آئے بلکہ اپنے سیل فون پر بے پناہ توجہ دینے آئے ہیں۔ یہ رویہ اب غیر معمولی نہیں رہا۔ ہر طرف ایک جیسے حالات ہیں۔ اکثر لوگ کمپیوٹر اور فون کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے۔

تبدیلی ہر معاشرہ کا بنیادی جزو ہے۔ سماج بنیادی طور پر تغیر میں رہتا ہے۔ آج کے دور کو سو برس پہلے کے اصولوں کے حوالے سے دیکھنا ناممکن ہے۔ سو سال کو تو رہنے دیجئے۔ پندرہ سے بیس برس میں ٹیکنالوجی کا جو انقلاب آیا ہے، اس نے دنیا کے ہر انسان کی زندگی تبدیل کر دی ہے۔ فیس بک، ٹویٹر اور سوشل میڈیا کے دیگر معاملات نے رہن سہن کے طور پر یقینی مکمل طور پر بدل دیے ہیں۔ سیل فون اب اس اہمیت کا حامل ہو چکا ہے جیسے انسانی جسم کا کوئی اہم ترین حصہ ہو۔ غیر متعصب طریقے سے دیکھا جائے تو اب اس پورے مرحلے کو ختم یا تبدیل کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ ہمارے پورے ملک میں کسی قسم کا کوئی تجزیہ نہیں ہو رہا کہ ان تمام عوامل کے سماجی زندگی پر کتنے منفی اثرات پڑ رہے ہیں اور لوگ کس تیزی سے تنہائی جیسی مہلک بیماری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ابھی ہم شعوری سطح پر اس طرح کے پیچیدہ تجزیہ کرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ عام آدمی کی حیثیت سے آنکھیں کھول کر چاروں طرف غور سے دیکھیے تو چند حقائق یکسر عجیب سے نظر آئیں گے۔ اس میں تنہائی کا المیہ سرفہرست ہوگا۔

ترقی کے قطعاً خلاف نہیں ہوں۔ مگر ترقی انسان کو اگر کسی منفی گھاٹی میں لے جائے، تو اس کے متعلق سو بار سوچنا چاہیے۔ چار سے پانچ دہائیاں پہلے پاکستان کسی اور طرح کا ملک تھا۔ سیاسی طور پر عرض نہیں کر رہا بلکہ سماجی نقطہ نظر سے گزارش کر رہا ہوں۔ خاندان کا یونٹ یا بنیاد بہت مضبوط تھی۔ مسائل اس وقت بھی تھے۔ مگر ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کا رویہ قطعاً موجود نہیں تھا۔ گھر میں والد، والدہ، دادا، دادی، دیگر بزرگ خاندان میں اجتماعی زندگی گزارتے نظر آتے تھے۔ یہ ایک معمول تھا۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں تھا۔ ہر گھر میں بزرگوں کو عزت اور احترام حاصل تھا، جو اب مفقود نظر آتا ہے۔ بزرگ مرد اور خواتین گھر کا وہ سرمایہ تھے جو گھر میں نظم و ضبط پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ کوئی افسانوی بات نہیں کر رہا۔ کھانے کا ایک وقت متعین تھا۔ کھیل کود اور دوستوں سے ملکر واپسی کے اوقات بھی مقرر تھے۔ اگر دیر ہو جائے تو گھر کے بزرگ گیٹ کے باہر کھڑے ہو کر انتظار کرتے نظر آتے تھے۔ یہ تقریباً ہر گھر کی کہانی تھی۔ اسکے علاوہ محلوں قصبوں میں بزرگ بھی سانچے ہوتے تھے۔ بچے اور بچیوں پر صرف گھر کے افراد ہی کڑی نظر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ محلوں کے سنجیدہ افراد، بچوں کو کسی سماجی برائی میں ملوث ہونے پر بڑی اپنائیت سے ٹوکتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا، شوخی میں آ کر سگریٹ پینے کی کوشش کرتا تھا، تو اسکی کوشش ہوتی تھی کہ محلے یا خاندان کا کوئی بزرگ اسے دیکھ نہ لے۔ کسی قسم کی مبالغہ آرائی کے بغیر عرض کروں گا کہ سماجی طور پر خاندان ایک اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ محلہ یا قصبہ بڑی اکائی کی شکل لے لیتا تھا۔ اس توازن کو تبدیل ہونا ہی تھا۔ یہ تبدیلی ناگزیر تھی مگر ضروری نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ خاندان کی ساخت تبدیل ہو گئی۔ جیسے ہی شادی ہوئی۔ الگ گھر یا پرانے گھر سے ہجرت معمول بن گئی۔ اپنے ہی بزرگوں سے دوری کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان اور بزرگ دونوں اپنی جگہ مکمل طور پر اکیلے ہو گئے۔ تنہائی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے

لیا۔ بڑے شہروں میں معاملات مزید تبدیل یا خراب ہو گئے۔ کسی کو دوسرے کے متعلق علم نہیں رہا۔ لاہور شہر کی عرض کرتا ہوں۔ میرے ایک دوست لاہور میں "اولڈ ہوم" کھولنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ خیال تھا کہ لوگ بزرگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی روش کو تبدیل کر رہے ہیں۔ میرا، دوست سے بہت اختلاف تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیٹا اپنے ہی باپ کو کسی دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ مگر ششدر رہ گیا، جب دوست نے بتایا کہ یہاں چند اولڈ ہوم کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی یقین نہ آیا۔ دیکھنے پر اصرار کیا۔ دوست، مجھے شادمان لے گیا۔ وہاں ایک گھر کی پہلی منزل پر تین کمروں پر مشتمل ایک اولڈ ہوم موجود تھا۔ ایک کمرے میں ایک انتہائی ضعیف خاتون، ہسپتال والے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک نرس انہیں کھانا کھلا رہی تھی۔ جسے خاتون بڑی مشکل سے نکل پارہی تھی۔ ساتھ ہی ایک فلپائنی نرس موجود تھی۔ اس بزرگ خاتون کی دوائیوں کا چارٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی، کہ کھانا ختم ہو تو خاتون کو دوائیاں کھلائے۔ کمرے میں ایک کیمرہ لگا ہوا تھا۔ اسکی بدولت بزرگ خاتون اپنے خاندان سے منسلک تھی۔ سارے بچے اور بچیاں امریکہ میں تھے۔ ماں کو بذریعہ کیمرہ، اپنے لیپ ٹاپ یا موبائل فون پر دیکھ سکتے تھے۔ سال میں دو بار تمام بچے ماں کو دیکھنے کیلئے آتے بھی تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ عمر رسیدہ ماں کو کئی بیماریاں تھیں۔ مگر ایک بیماری تنہائی بھی تھی۔ جس کا علاج نہ کوئی دوائی کر سکتی تھی اور نہ ہی کوئی نرس یا تیمار دار کی مصنوعی سی ہمدردی۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا، امریکہ اور یورپ کی طرح ہمارے ملک میں بھی بزرگوں کیلئے اولڈ ہوم بنتے جائینگے۔ انکے لیے فائینو سٹارٹ کے "اولڈ ہوم" بھی بنا دیے جائیں۔ مگر جس خاندانی اور سماجی نظام میں ایک دوسرے سے منسلک تھے، شاید اسکی غیر موجودگی میں ہم انکی تنہائی کے المیہ کا اندازہ ہی نہ لگا سکیں۔

یہ سب کچھ صرف بزرگوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ایک بھرپور تعداد اس بیماری کا شکار بن چکے ہیں۔ انکی قربت اپنے بھائی یا بہن سے اس سطح کی نہیں ہے جس طرح کی سوشل میڈیا اور فیس بک کے دوستوں سے ہے۔ ادھیڑ عمر کے انسان، خاص طور پر اس تنہائی کے سیلاب میں خاموشی سے غرق ہو رہے ہیں۔ یعنی اب ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں، جو انفرادی زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اب جس "سماجی تنہائی" کو مہلک ترین بیماری بتایا جا رہا ہے۔ ہم اس میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی کبھی اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم کبھی بھی اس پر قابو پانے کیلئے ایک مرتب حکومتی سماجی پالیسی ترتیب نہیں دینگے۔ ہم انکار کرتے کرتے جان گنوا دینگے مگر اسکے علاج کی طرف غور نہیں کریں گے۔ برطانیہ اگر وزیر برائے تنہائی مقرر کرنے پر مجبور ہو چکا ہے، تو ہمیں بھی اس لیے پرسنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ مگر شاید کبھی بھی ایسا کرنے کی جرات نہیں کریں گے۔ اسلیے کہ ہم ہر مسئلہ کو ٹالتے رہتے ہیں۔ جب وہ عفریب بنکر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، تو ہم ایک دوسرے سے بڑی معصومیت سے پوچھتے ہیں، کہ سب کچھ برباد کیسے ہو گیا!

راؤ منظر حیات